

تفہیم القرآن

الممتحنہ

(۲)

اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔^{۱۲} وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں۔^{۱۳}

۱۲۔ اس مقام پر ایک شخص کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ دشمنی نہ کرنے والے کافروں کے ساتھ نیکی برتاؤ تو خیر ٹھیک ہے، مگر کیا انصاف بھی صرف اُنہی کے لیے مخصوص ہے؟ اور کیا دشمن کافروں کے ساتھ بے انصافی کرنی چاہیے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سیاق و سباق میں دراصل انصاف ایک خاص مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص تمہارے ساتھ عداوت نہیں برتا، انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تم بھی اس کے ساتھ عداوت نہ برتو۔ دشمن اور غیر دشمن کو ایک درجہ میں رکھنا اور دونوں سے ایک ہی سا سلوک کرنا انصاف نہیں ہے۔ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے کا حق ہے جنہوں نے ایمان لانے کی پاداش میں تم پر ظلم توڑے، اور تم کو وطن سے نکل جانے پر مجبور کیا، اور نکالنے کے بعد بھی تمہارا پیچھا نہ چھوڑا۔ مگر جن لوگوں نے اس ظلم میں کوئی حصہ نہیں لیا، انصاف یہ ہے کہ تم ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور رشتے اور برادری کے لحاظ سے ان کے جو حقوق تم پر عائد ہوتے ہیں انہیں ادا کرنے میں کمی نہ کرو۔

۱۳۔ سابقہ آیات میں کفار سے جس ترک تعلق کی ہدایت کی گئی تھی اس کے متعلق لوگوں کو یہ غلط فہمی لاحق

اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو ان کے مومن ہونے کی، جانچ پڑتال کر لو، اور ان کے ایمان کی حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو۔ نہ وہ کفار کے لیے حلال ہیں اور نہ کفار

ہو سکتی تھی کہ یہ ان کے کافر ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس لیے ان آیات میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ اس کی اصل وجہ ان کا کفر نہیں بلکہ اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ ان کی عداوت اور ان کی ظالمانہ مدوش ہے۔ لہذا مسلمانوں کو دشمن کافر اور غیر دشمن کافر میں فرق کرنا چاہیے، اور ان کافروں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرنا چاہیے جنہوں نے کبھی ان کے ساتھ کوئی برائی نہ کی ہو۔ اس کی بہترین تشریح وہ واقعہ ہے جو حضرت اسماء بنت ابی بکر اور ان کی کافروں کے درمیان پیش آیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی ایک بیوی ثقیلہ بنت عبد العزیٰ کافرہ تھیں اور ہجرت کے بعد مکہ ہی میں رہ گئی تھیں۔ حضرت اسماء انہی کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب مدینہ اور مکہ کے درمیان آمد و رفت کا راستہ کھل گیا تو وہ بیٹی سے ملنے کے لیے مدینہ آئیں اور کچھ تحفہ تحائف بھی لائیں۔ حضرت اسماء کی اپنی روایت یہ ہے کہ میں نے جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، اپنی ماں سے مل لوں؟ اور کیا میں ان سے صلہ رحمی بھی کر سکتی ہوں؟ حضور نے جواب دیا اس سے صلہ رحمی کرو (مسند احمد - بخاری - مسلم)۔ حضرت اسماء کے صاحبزادے عبداللہ بن زبیر اس واقعہ کی مزید تفصیل یہ بیان کرتے ہیں کہ پہلے حضرت اسماء نے ماں سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ بعد میں جب اللہ اور اس کے رسول کی اجازت مل گئی تب وہ ان سے ملیں (مسند احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم)۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اپنے کافراں باپ کی خدمت کرنا اور اپنے کافر بھائی بہنوں اور رشتہ داروں کی مدد کرنا جائز ہے جبکہ وہ دشمن اسلام نہ ہوں۔ اور اسی طرح ذمی مساکین پر صدقات بھی صرف کیے جاسکتے ہیں (احکام القرآن مجتہد ص - روح المعانی)۔

۴۷۱ اس حکم کا پس منظر یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد اول اول تو مسلمان مروکہ سے بھاگ بھاگ کر مدینہ آتے رہے اور انہیں معاہدے کی شرائط کے مطابق واپس کیا جانا رہا۔ پھر مسلمان عورتوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور سب سے پہلے اتم کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط ہجرت کر کے مدینہ پہنچیں۔ کفار نے معاہدے کا حوالہ دے کر ان کی واپسی کا بھی مطالبہ کیا اور ام کلثوم کے دو بھائی ولید بن عقبہ اور عمارہ بن عقبہ انہیں واپس لے جانے کے

لیے دینے پہنچ گئے۔ اس وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا حدیث نبویہ کے معاہدے کا اطلاق عورتوں پر بھی ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اسی سوال کا یہاں جواب دیا ہے کہ اگر وہ مسلمان ہوں اور یہ اطمینان کر لیا جائے کہ واقعی وہ ایمان ہی کی خاطر ہجرت کر کے آتی ہیں، کوئی اور چیز انہیں نہیں لاتی ہے، تو انہیں واپس نہ کیا جائے۔

اس مقام پر احادیث کی سواہت بالمعنی سے ایک بڑی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے جسے حل کرنا ضروری ہے۔ صلح حدیبیہ کی شرائط کے متعلق احادیث میں جو روایات ہیں جہاں حدیثیں ملتی ہیں وہ اکثر و بیشتر بالمعنی روایات ہیں۔ زبیر بنت شمر کے متعلق ان میں سے کسی روایت کے الفاظ یہ ہیں: "من جاء منكم لعمركم نرداه عليكم ومن جاءكم منا ردتموه علينا۔" تم میں سے جو شخص ہمارے پاس آئے گا اسے ہم واپس نہ کریں گے اور ہم میں سے جو تمہارے پاس جائے گا اسے تم واپس کر دو گے۔ کسی میں یہ الفاظ ہیں، "من اتى رسول الله من اصحابه بغير اذن وليه رده عليه۔" رسول اللہ کے پاس ان کے اصحاب میں سے جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر آئے گا اسے وہ واپس کر دیں گے۔ اور کسی میں ہے "من اتى محمداً من قريش بغير اذن وليه رده عليهم۔" قریش میں سے جو شخص محمد کے پاس اپنے ولی کی اجازت کے بغیر جائے گا اسے وہ قریش کو واپس دینگے۔ ان روایات کا طرز بیان خود بہ ظاہر کر رہا ہے کہ ان میں معاہدے کی اس شرط کو ان الفاظ میں نقل نہیں کیا گیا ہے جو اصل معاہدے میں لکھے گئے تھے، بلکہ راویوں نے ان کا مفہوم خود اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ لیکن چونکہ بکثرت روایات اسی نوعیت کی ہیں اس لیے عام طور پر مفسرین و محدثین نے اس سے یہی سمجھا کہ معاہدہ عام تھا جس میں عورت مرد سب داخل تھے اور عورتوں کو بھی اس کی رو سے واپس ہونا چاہیے تھا۔ اس کے بعد جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم آیا کہ مومن عورتیں واپس نہ کی جائیں تو ان حضرات نے اس کی یہ تاویل کی کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومن عورتوں کی حد تک معاہدہ توڑ دینے کا فیصلہ فرما دیا۔ مگر یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے جس کو اس آسانی کے ساتھ قبول کر لیا جائے۔ اگر معاہدہ فی الواقع بلا تخصیص مرد و زن سب کے لیے عام تھا تو آخر یہ کیسے جائز ہو سکتا تھا کہ ایک فریق اس میں ایک طرف ترمیم کر دے یا اس کے کسی جز کو بطور خود بدل ڈالے اور بالفرض ایسا کیا بھی گیا تھا تو یہ کیسی عجیب بات ہے کہ قریش کے لوگوں نے اس پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔ قریش والے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی ایک بات پر گرفت کرنے کے لیے خار کھانے بیٹھے تھے۔ انہیں اگر یہ بات

ہاتھ آجاتی کہ آپ شرائط معاہدہ کی صریح خلافت درزی کر گزرے ہیں تو وہ زمین و آسمان سر پر اٹھالیتے۔ لیکن ہمیں کسی روایت میں اس کا شائبہ تک نہیں ملتا کہ انہوں نے قرآن کے اس فیصلے پر ذرہ برابر بھی چون دچرا کی ہو۔ یہ ایسا سوال تھا جس پر غور کیا جاتا تو معاہدے کے اصل الفاظ کی جستجو کر کے اس پھیدگی کا حل تلاش کیا جاتا، مگر بہت سے لوگوں نے تو اس کی طرف توجہ نہ کی، اور بعض حضرات مثلاً قاضی ابوبکر ابن عربی، نے توجہ کی بھی تو انہوں نے قریش کے اعتراض نہ کرنے کی یہ توجیہ تک کرنے میں تامل نہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ اس معاملہ میں قریش کی زبان بند کر دی تھی۔ تعجب ہے کہ اس توجیہ پر ان حضرات کا ذہن کیسے مطمئن ہوا۔

اصل بات یہ ہے کہ معاہدہ صلح کی یہ شرط مسلمانوں کی طرف سے نہیں بلکہ کفار قریش کی طرف سے تھی، اور ان کی جانب سے ان کے نمائندے سہیل بن عمرو نے جو الفاظ معاہدے میں لکھوائے تھے وہ یہ تھے: علی ان لا یتذمنا رجلاً و ان کان علی دینک الادر و ذلک العینا۔ اور یہ کہ تمہارے پاس ہم میں سے کوئی مرد بھی آئے، اگر چہ وہ تمہارے دین ہی پر ہو، تم اسے ہماری طرف واپس کر دو گے۔ معاہدے کے یہ الفاظ بخاری، کتاب الشروط، باب الشرطی و الجہاد و المصالحہ میں قوی سند کے ساتھ نقل ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سہیل نے رَجُلٍ کا لفظ شخص کے معنی میں استعمال کیا ہو، لیکن یہ اس کی ذمہ داری مراد ہوگی، معاہدے میں جو لفظ لکھا گیا تھا وہ رَجُلٌ ہی تھا جو عربی زبان میں مرد کے لیے بولا جاتا ہے۔ اسی بنا پر جب اُم کلثوم بنت عقیبہ کی واپسی کا مطالبہ کے کر ان کے بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو امام زہری کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واپس کرنے سے یہ کہہ کر انکار فرمایا کہ کان الشرط فی الرجال و ان النساء بشر مردوں کے بارے میں تھی نہ کہ عورتوں کے بارے میں۔ احکام القرآن، ابن عربی تفسیر کبیر، امام رازی، اس وقت تک خود قریش کے لوگ بھی اس غلط فہمی میں تھے کہ معاہدے کا اطلاق ہر طرح کے ہاجرین پر ہوتا ہے، خواہ وہ مرد ہوں یا عورت۔ مگر جب حضور نے ان کو معاہدے کے ان الفاظ کی طرف توجہ دلائی تو وہ دم بخود رہ گئے اور انہیں ناچار اس فیصلے کو ماننا پڑا۔

معاہدے کی اس شرط کے لحاظ سے مسلمانوں کو حق تھا کہ جو عورت بھی مکہ چھوڑ کر مدینے آتی، خواہ وہ کسی غرض سے آتی، اسے واپس دینے سے انکار کر دیتے لیکن اسلام کو صرف مومن عورتوں کی حفاظت سے دلچسپی تھی، ہر طرح کی بھاگنے والی عورتوں کے لیے مدینہ طیبہ کو پناہ گاہ بنانا مقصود نہ تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جو عورتیں ہجرت لگے

تین اور اپنے مومن ہونے کا اظہار کریں، ان سے پوچھ گچھ کر کے اپنا اطمینان کر لو کہ وہ واقعی ایمان سے کرا آتی ہیں، اور جب اس کا اطمینان ہو جائے تو ان کو واپس نہ کرو۔ چنانچہ اس ارشاد الہی پر علماء آمد کرنے کے لیے جو فائدہ بنا لیا گیا وہ یہ تھا کہ جو عورتیں ہجرت کر کے آتی تھیں ان سے پوچھا جاتا تھا کہ کیا وہ اللہ کی توحید اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتی ہیں اور حضرت اللہ اور اس کے رسول کی خاطر نکل کر آئی ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ شوہر سے بگڑ کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی ہوں؟ یا ہمارے ہاں کے کسی مرد کی محبت ان کو لے آئی ہو؟ یا کوئی اور دنیوی غرض ان کے اس فعل کی محرک ہوئی ہو؟ ان سوالات کا اطمینان بخش جواب جو عورتیں دے دیتی تھیں صرف ان کو روک لیا جاتا تھا، باقی سب کو واپس کر دیا جاتا تھا۔ ابن جریر، بحوالہ ابن عباس، قتادہ، مجاہد، عکرمہ، ابن زید۔

اس آیت میں قانون شہادت کا بھی ایک اصولی ضابطہ بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی مزید توضیح اُس طریقے کا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر علماء آمد کے لیے مقرر فرمایا تھا۔ آیت میں تین باتیں فرمائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ہجرت کرنے والی جو عورتیں اپنے آپ کو مومن ہونے کی حیثیت سے پیش کریں ان کے ایمان کی جانچ کرو۔ دوسرے یہ کہ ان کے ایمان کی حقیقت کو تو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، تمہارے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ وہ حقیقت میں ایمان لاتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ جانچ پڑتال سے جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انہیں واپس نہ کرو۔ پھر اس حکم کے مطابق ان عورتوں کے ایمان کی جانچ کرنے کے لیے جو طریقہ حضور نے مقرر فرمایا وہ یہ تھا کہ ان عورتوں کے حلفیہ بیان پر اعتماد کیا جائے اور ضروری جرح کر کے یہ اطمینان کر لیا جائے کہ ان کی ہجرت کا محرک ایمان کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ اس سے اول تو یہ قاعدہ معلوم ہوا کہ معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے عدالت کو حقیقت کا علم حاصل ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ صرف وہ علم کافی ہے جو شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی کہ ہم ایک شخص کے حلفیہ بیان پر اعتماد کریں گے تا وقتیکہ کوئی صریح قرینہ اس کے کاذب ہونے پر دلالت نہ کر رہا ہو۔ تیسری بات یہ معلوم ہوتی کہ آدمی اپنے عقیدے اور ایمان کے متعلق خود جو خبر دے رہا ہو ہم اسے قبول کریں گے اور اس بات کی کھوج میں نہ پڑیں گے کہ فی الواقع اس کا وہی عقیدہ ہے جو وہ بیان کر رہا ہے، الایہ کہ کوئی صریح علامت ہمارے سامنے ایسی ظاہر ہو جائے جو اس کی تردید کر رہی ہو۔ اور چوتھی بات یہ کہ ایک شخص کے جن ذاتی حالات کو دوسرا کوئی نہیں جان سکتا ان میں اسی کے بیان

ان کے لیے حلال۔ ان کے کافر شوہروں نے جو ہران کو دیشے تھے وہ انہیں پھیر دو۔ اور ان سے نکاح کر لینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں جبکہ تم ان کے ہران کو ادا کر دو۔ اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رہو۔ جو ہر تم نے اپنی کافر بیویوں کو دیشے تھے وہ تم واپس مانگ لو اور جو ہر کافروں نے اپنی مسلمان بیویوں کو دیشے تھے انہیں وہ واپس مانگ لیں۔ یہ اللہ کا حکم ہے، وہ

پر بھروسہ کیا جاتے گا، مثلاً طلاق اور عدت کے معاملات میں عدت کے حیض اور طہر کے متعلق اس کا اپنا بیان ہی معتبر ہوگا، خواہ وہ جھوٹ بولے یا سچ۔ انہی قواعد کے مطابق علم حدیث میں بھی ان روایات کو قبول کیا جائے گا جن کے راویوں کا ظاہر حال ان کے راستباز ہونے کی شہادت دے رہا ہو، الایہ کہ کچھ دوسرے قرائن ایسے موجود ہوں جو کسی روایت کے قبول میں مانع ہوں۔

۱۵۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے کافر شوہروں کو ان کے جو ہر واپس کیے جائیں گے وہی ان عورتوں کے ہر شمار نہ ہوں گے، بلکہ اب جو مسلمان بھی ان میں سے کسی عورت سے نکاح کرنا چاہے وہ اس کا ہر ادا کرے اور اس سے نکاح کرے۔

۱۶۔ ان آیات میں پارٹریسے اہم حکم بیان کیے گئے ہیں جن کا تعلق اسلام کے عائلی قانون سے بھی ہے اور بین الاقوامی قانون سے بھی:

اول یہ کہ جو عورت مسلمان ہو جاتے وہ اپنے کافر شوہر کے لیے حلال نہیں رہتی اور نہ کافر شوہر اس کے لیے حلال رہتا ہے۔

دوسرے یہ کہ جو منکوحہ عورت مسلمان ہو کر دارالکفر سے دارالاسلام میں ہجرت کر آئے اس کا نکاح آپ سے آپ ٹوٹ جاتا ہے اور جو مسلمان بھی چاہے اس کا ہر دے کہ اس سے نکاح کر سکتا ہے۔

تیسرے یہ کہ جو مرد مسلمان ہو جاتے اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کی بیوی اگر کافر ہے تو وہ اسے اپنے نکاح میں روکے رکھے۔

چوتھے یہ کہ اگر دارالکفر اور دارالاسلام کے درمیان صلح کے تعلقات موجود ہوں تو اسلامی حکومت کو دارالکفر کی حکومت سے یہ معاملہ طے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ کفار کی جو منکوحہ عورتیں مسلمان ہو کر دارالاسلام

میں ہجرت کر آئی ہوں ان کے ہم مسلمانوں کی طرف سے واپس رہے دیئے جائیں، اور مسلمانوں کی منکوحہ کافر عورتیں جو دارالکفر میں رہ گئی ہوں ان کے ہر کفار کی طرف سے واپس مل جائیں۔

ان احکام کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ آغاز اسلام میں بکثرت مرد ایسے تھے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا مگر ان کی بیویاں مسلمان نہ ہوئیں۔ اور بہت سی عورتیں ایسی تھیں جو مسلمان ہو گئیں مگر ان کے شوہروں نے اسلام قبول نہ کیا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی حضرت زینبؓ کے شوہر ابوالعاص غیر مسلم تھے اور کئی سال تک غیر مسلم رہے۔ ابتدائی دور میں ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ مسلمان عورت کے لیے اس کا کافر شوہر اور مسلمان مرد کے لیے اس کی مشرک بیوی حلال نہیں ہے۔ اس لیے ان کے درمیان ازدواجی رشتے برقرار رہے۔ ہجرت کے بعد بھی کئی سال تک یہ صورت حال رہی کہ بہت سی عورتیں مسلمان ہو کر ہجرت کر آئیں اور ان کے کافر شوہر دارالکفر میں رہے۔ اور بہت سے مسلمان مرد ہجرت کر کے آگئے اور ان کی کافر بیویاں دارالکفر میں رہ گئیں۔ مگر اس کے باوجود ان کے درمیان رشتہ ازدواج قائم رہا۔ اس سے خاص طور پر عورتوں کے لیے بڑی پیچیدگی پیدا ہو رہی تھی، کیونکہ مرد تو دوسرے نکاح بھی کر سکتے تھے، مگر عورتوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ جب تک سابق شوہروں سے ان کا نکاح فسخ نہ ہو جائے وہ کسی اور شخص سے نکاح کر سکیں۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب یہ آیات نازل ہوئیں تو انہوں نے مسلمانوں اور کفار و مشرکین کے درمیان سابق کے ازدواجی رشتوں کو ختم کر دیا اور آئندہ کے لیے ان کے بارے میں ایک ضمنی اور واضح قانون بنا دیا۔ فقہائے اسلام نے اس قانون کو چار بڑے بڑے عنوانات کے تحت مرتب کیا ہے :

ایک، وہ حالت جس میں زوجین دارالاسلام میں ہوں اور ان میں سے ایک مسلمان ہو جائے اور دوسرا کافر رہے۔

دوسرے، وہ حالت جس میں زوجین دارالکفر میں ہوں اور ان میں سے ایک مسلمان ہو جائے اور دوسرا کافر رہے۔

تیسرے، وہ حالت جس میں زوجین میں سے کوئی ایک مسلمان ہو کر دارالاسلام میں ہجرت کر کے آجائے اور دوسرا دارالکفر میں کافر رہے۔

چوتھے، وہ حالت جس میں مسلم زوجین میں سے کوئی ایک مرتد ہو جائے۔

ذیل میں ہم ان چاروں حالتوں کے متعلق فقہاء کے مسالک الگ الگ بیان کرتے ہیں :

(۱) پہلی صورت میں اگر اسلام شوہر نے قبول کیا ہو اور اس کی بیوی عیسائی یا یہودی ہو اور وہ اپنے

دین پر قائم رہے تو دونوں کے درمیان نکاح باقی رہے گا، کیونکہ مسلمان مرد کے لیے اہل کتاب بیوی جائز ہے۔ یہ امر تمام فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہے۔

اور اگر اسلام قبول کرنے والے مرد کی بیوی غیر اہل کتاب میں سے ہو اور وہ اپنے دین پر قائم رہے، تو خفیہ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ عورت کے سامنے اسلام پیش کیا جائے گا، قبول کرے تو نکاح باقی رہے گا، نہ قبول کرے تو ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی۔ اس صورت میں اگر زوجین کے درمیان خلوت ہو چکی ہو تو عورت مہر کی مستحق ہوگی، اور خلوت نہ ہوئی ہو تو اس کو مہر بانے کا حق نہ ہوگا، کیونکہ فرقت اُس کے انکار کی وجہ سے واقع ہوئی ہے (المبسوط، ہدایہ، فتح القدیر)۔ امام شافعی اور امام احمد کہتے ہیں کہ اگر زوجین کے درمیان خلوت نہ ہوئی ہو تو مرد کے اسلام قبول کرتے ہی عورت اس کے نکاح سے باہر ہو جائیگی اور اگر خلوت ہو چکی ہو تو عورت تین مرتبہ آیام ماہواری آتے تک اس کے نکاح میں رہے گی، اس دوران میں وہ خود اپنی مرضی سے اسلام قبول کرے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ تیسری بار آیام سے فارغ ہونے ہی آپسے آپ فسخ ہو جائے گا۔ امام شافعی یہ بھی فرماتے ہیں کہ ذمیوں کو ان کے مذہب سے تعرض نہ کرنے کی جو ضمانت ہماری طرف سے دی گئی ہے اس کی بنا پر یہ درست نہیں ہے کہ عورت کے سامنے اسلام پیش کیا جائے۔ لیکن درحقیقت یہ ایک کمزور بات ہے، کیونکہ ایک ذمی عورت کے مذہب سے تعرض تو اس صورت میں ہوگا جبکہ اس کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اُس سے صرف یہ کہنا کوئی بے جا تعرض نہیں ہے کہ تو اسلام قبول کرے تو اپنے شوہر کے ساتھ رہ سکے گی ورنہ تجھے اس سے الگ کر دیا جائے گا۔ حضرت علیؑ کے زمانے میں اس کی نظیر پیش بھی آچکی ہے۔ عراق کے ایک مجوسی زمیندار نے اسلام قبول کیا اور اس کی بیوی کافر رہی۔ حضرت علیؑ نے اس کے سامنے اسلام پیش فرمایا۔ اور جب اس نے انکار کیا تب آپ نے دونوں کے درمیان تفریق کرادی (المبسوط)۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر خلوت نہ ہو چکی ہو تو مرد کے اسلام لاتے ہی اس کی کافر بیوی اس سے فوراً جدا ہو جائے گی اور اگر خلوت ہو چکی ہو تو عورت کے سامنے اسلام پیش کیا جائے گا اور اس کے انکار کی صورت میں جدائی واقع ہو جائے گی (المغنی لابن قدامہ)۔

اور اگر اسلام قبول کرنے والی عورت ہو اور مرد کافر رہے، خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہو یا غیر اہل کتاب

میں سے، تو خفیہ کہتے ہیں کہ خواہ دونوں میں خلوت ہو چکی ہو یا نہ ہو، ہر صورت میں شوہر کے سامنے اسلام پیش کیا جائے گا، قبول کر لے تو عدت اس کے نکاح میں رہے گی، انکار کر دے تو قاضی دونوں میں تفریق کر اڑے گا۔ اس دوران میں جب تک مرد اسلام سے انکار نہ کرے، عورت اس کی بیوی تو رہے گی مگر اس کو مفارقت کا حق نہ ہوگا۔ شوہر کے انکار کی صورت میں تفریق طلاق بائن کے حکم میں ہوگی۔ اگر اس سے پہلے خلوت نہ ہوئی ہو تو عورت نصف ہرمانے کی حق دار ہوگی، اور خلوت ہو چکی ہو تو عورت پورا ہرمانے کی اور عدت کا نفقہ بھی بالمبسوط ہدایہ فتح القدر ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک خلوت نہ ہونے کی صورت میں عورت کے اسلام قبول کرتے ہی نکاح فسخ ہو جائے گا، اور خلوت ہونے کی صورت میں عدت ختم ہونے تک عورت اس مرد کے نکاح میں رہے گی۔ اس مدت کے اندر وہ اسلام قبول کرے تو نکاح باقی رہے گا ورنہ عدت گزرتے ہی بُدائی واقع ہو جائے گی۔ لیکن مرد کے معاملے میں بھی امام شافعیؒ نے وہی رائے ظاہر کی ہے جو عورت کے معاملے میں اوپر منقول ہوئی کہ اس کے سامنے اسلام پیش کرنا جائز نہیں ہے، اور یہ مسلک بہت کمزور ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں متعدد واقعات ایسے پیش آئے ہیں کہ عدت نے اسلام قبول کر لیا اور مرد سے اسلام لانے کے لیے کہا گیا اور جب اس نے انکار کر دیا تو دونوں کے درمیان تفریق کرادی گئی۔ مثلاً بنی تغلب کے ایک عیسائی کی بیوی کا معاملہ ان کے سامنے پیش ہوا۔ انہوں نے مرد سے کہا یا تو تو اسلام قبول کر لے ورنہ میں تم دونوں کے درمیان تفریق کر دوں گا۔ اس نے انکار کیا اور آپ نے تفریق کی ڈگری دے دی۔ بہز الملک کی ایک نو مسلم زمیندارنی کا مقدمہ ان کے پاس بھیجا گیا۔ اس کے معاملے میں بھی انہوں نے حکم دیا کہ اس کے شوہر کے سامنے اسلام پیش کیا جائے، اگر وہ قبول کر لے تو بہتر، ورنہ دونوں میں تفریق کرادی جائیے۔ اہل بیتؑ کے سامنے پیش آئے تھے اور کسی اختلاف منقول نہیں (احکام القرآن مجتہدین بالمبسوط فتح القدر ص ۱۸۱) کی رائے میں یہ ہے کہ اگر خلوت پہلے عورت مسلمان ہو جائے تو شوہر کے سامنے اسلام پیش کیا جاوے تو قبول کرے تو بہتر ورنہ خود تفریق کرادی جائے اور اگر خلوت ہو چکی ہو اور عدت اسلام لائی ہو تو نہ ماخذ ختم ہونے تک انتظار کیا جائے اس میں شوہر اسلام قبول کرے تو صلح باقی رہے گا، ورنہ عدت گزرتے ہی وقت واقع ہو جائے گی۔ امام احمدؒ کا ایک قول امام شافعیؒ کی تائید میں، اور دوسرا قول یہ ہے کہ زوجین کے درمیان اختلاف دین واقع ہو جائے حال فردی تفریق کا موجب ہے خواہ خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو (مغنی)۔

(۲) دار اکفر میں اگر عورت مسلمان ہو جائے اور مرد کافر رہے، یا مرد مسلمان ہو جائے اور اس کی بیوی

رجوعیاتی یا یہودی نہ ہو بلکہ کسی غیر کتابی مذہب کی ہو، اپنے مذہب پر قائم رہے، تو خفیہ کے نزدیک خواہ ان کے

درمیان خلوت ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو، تفریق واقع نہ ہوگی جب تک عورت کو تین مرتبہ گاہ باری نہ آجائیں، یا اس کے غیر حائضہ ہونے کی صورت میں تین مہینے نہ گزر جائیں۔ اس دوران میں اگر دوسرا فریق بھی مسلمان ہو جائے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ یہ مدت گزرتے ہی فرقت واقع ہو جائے گی۔ امام شافعیؒ اس معاملہ میں بھی خلوت اور عدم خلوت کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اگر خلوت نہ ہوئی ہو تو زوجین کے درمیان دین کا اختلاف واقع ہوتے ہی فرقت ہو جائے گی، اور اگر خلوت ہو جانے کے بعد دین کا اختلاف رونما ہوا ہو تو عدت کی مدت ختم ہونے تک ان کا نکاح باقی رہے گا۔ اس دوران میں اگر دوسرا فریق اسلام قبول نہ کرے تو عدت ختم ہونے کے ساتھ ہی نکاح بھی ختم ہو جائے گا (المبسوط، فتح القدیر، احکام القرآن مجتہدین)۔

(۳) جس صورت میں زوجین کے درمیان اختلاف دین کے ساتھ اختلاف داری بھی واقع ہو جائے، یعنی ان میں سے کوئی ایک دارالکفر میں کافر رہے اور دوسرا دارالاسلام کی طرف ہجرت کر جائے، اس کے متعلق حنفیہ کہتے ہیں کہ دونوں کے درمیان نکاح کا تعلق آپس سے آپ ختم ہو جائے گا۔ اگر ہجرت کرنے والی عورت ہوتی ہے تو فوراً دوسرا نکاح کر لینے کا حق حاصل ہے، اس پر کوئی عدت نہیں ہے، البتہ مقابرت کے لیے اس کے شوہر کو استبراء اور عہ کی خاطر ایک مرتبہ ایام ماہواری آجانے تک انتظار کرنا ہوگا، اور اگر وہ حاملہ ہو تب بھی نکاح ہو سکتا ہے مگر مقابرت کے لیے وضع حمل تک انتظار کرنا ہوگا۔ امام ابو یوسف اور امام محمد نے اس مسئلے میں امام ابو حنیفہؒ سے مرث اتنا اختلاف کیا ہے کہ ان کے نزدیک عورت پر عدت لازم ہے، اور اگر وہ حاملہ ہو تو وضع حمل سے پہلے اس کا نکاح نہیں ہو سکتا (المبسوط۔ ہدایہ۔ احکام القرآن مجتہدین)۔ امام شافعیؒ، امام احمد اور امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اختلاف داری کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ اصل چیز مرث اختلاف دین ہے۔ یہ اختلاف اگر زوجین میں واقع ہو جائے تو احکام وہی ہیں جو دارالاسلام میں زوجین کے درمیان یہ اختلاف واقع ہونے کے احکام ہیں (المغنی)۔ امام شافعیؒ اپنی مذکورہ بالا رائے کے ساتھ ساتھ ہجرت کر کے آنے والی مسلمان عورت کے معاملہ میں یہ رائے بھی ظاہر کرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے کافر شوہر سے لڑکر اس کے حق زوجیت کو ساقط کرنے کے ارادے سے آئی ہو۔ تو اختلاف داری کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے اس قصد کی بنا پر فوراً فرقت واقع ہو جائے گی (المبسوط و ہدایہ)۔

لیکن قرآن مجید کی زیر بحث آیت پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس معاملہ صحیح ترین رائے وہی ہے

جو امام ابوحنیفہؒ نے ظاہر فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ہجرت کر کے آنے والی مومن عورتوں ہی کے بارے میں نازل فرمائی ہے اور انہی کے حق میں یہ فرمایا ہے کہ وہ اپنے ان کافر شوہروں کے لیے حلال نہیں رہیں جنہیں وہ دارالکفر میں چھوڑ آئی ہیں اور دارالاسلام کے مسلمانوں کو اجازت ہے کہ وہ ان کے مہراں کر کے ان سے نکاح کر لیں۔ دوسری طرف مہاجر مسلمانوں سے خطاب کر کے یہ فرمایا ہے کہ اپنی ان کافر بیویوں کو اپنے نکاح میں نہ رکھو جو دارالکفر میں رہ گئی ہیں اور کفار سے اپنے وہ مہر واپس مانگا لو جو تم نے ان عہدوں کو دیتے تھے ظاہر ہے کہ یہ صرف اختلافِ دین ہی کے احکام نہیں ہیں بلکہ ان احکام کو جس چیز نے یہ خاص شکل دی ہے وہ اختلافِ دار ہے۔ اگر ہجرت کی بنا پر مسلمان عورتوں کے نکاح ان کے کافر شوہروں سے ٹوٹ نہ گئے ہوتے تو مسلمانوں کو ان سے نکاح کر لینے کی اجازت کیسے دی جاسکتی تھی اور وہ بھی اس طرح کہ اس اجازت میں عدت کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں ہے۔ اسی طرح اگر لائمسکوا بعصم الکوافر کا حکم آجانے کے بعد بھی مسلمان مہاجرین کی کافر بیویاں ان کے نکاح میں باقی رہ گئی ہوتیں تو ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دیا جاتا کہ انہیں طلاق دے دو، مگر یہاں اس کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں۔ بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضرت عمرؓ اور حضرت طلحہؓ اور بعض دوسرے مہاجرین نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی تھی، مگر یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ ان کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا اور ان بیویوں کے ساتھ تعینِ زوجیت کا انقطاع ان کے طلاق دینے پر موقوف تھا، اور اگر وہ طلاق نہ دیتے تو وہ بیویاں ان کے نکاح میں باقی رہ جاتیں۔

اس کے جواب میں عہدِ نبوی کے نین واقعات کی نظیر میں پیش کی جاتی ہیں جن کو اس امر کا ثبوت قرار دیا جاتا ہے کہ ان آیات کے نزول کے بعد بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختلافِ دار کے باوجود مومن اور کافر زوجین کے درمیان نکاح کا تعلق برقرار رکھا۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ فتح مکہ سے ذرا پہلے ابوسفیانؓ قرآنِ ظہران (موجودہ وادیِ خاضر) کے مقام پر لشکرِ اسلام میں آئے اور یہاں انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور ان کی بیوی ہند مکہ میں کافر رہیں پھر فتح مکہ کے بعد ہند نے اسلام قبول کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تجدیدِ نکاح کے بغیر ہی ان کو سابق نکاح پر برقرار رکھا۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد عکرمہ بن ابی جہل اور حکیم بن حزام مکہ سے فرار ہو گئے اور ان کے پیچھے دونوں کی بیویاں مسلمان ہو گئیں۔ پھر انہوں نے حضور سے اپنے شوہروں کے لیے امان لے لی اور جا کر ان کو لے آئیں۔ دونوں اصحاب

نے حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بھی سابق نکاحوں کو برقرار رکھا۔ تیسرا واقعہ حضور کی اپنی صاحبزادی حضرت زینب کا ہے جو ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئی تھیں اور ان کے شوہر ابو العاص بن جراح کفر مکہ ہی میں مقیم رہ گئے تھے۔ ان کے متعلق مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں ابن عباس کی روایت ہے کہ وہ شہدہ میں مدینہ آ کر مسلمان ہوئے اور حضور نے تجدید نکاح کے بغیر سابق نکاح ہی پر صاحبزادی کو ان کی زوجیت میں رہنے دیا۔ لیکن ان میں سے پہلے دو واقعے تو درحقیقت اختلافِ دار کی تعریف ہی میں نہیں آتے کیونکہ اختلافِ دار اس چیز کا نام نہیں ہے کہ ایک شخص عارضی طور پر ایک دار سے دوسرے دار کی طرف چلا گیا یا فرار ہو گیا، بلکہ یہ اختلاف صرف اس صورت میں واقع ہوتا ہے جب کوئی آدمی ایک دار سے منتقل ہو کر دوسرے دار میں آیا ہو جائے اور اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان موجودہ زمانے کی اصطلاح کے مطابق "قومیت" (NATIONALITY) کا فرق واقع ہو جائے۔ رہا سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا معاملہ تو اس کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت ابن عباس کی ہے جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، اور دوسری روایت حضرت خدیجہ بن عمرو بن عاص کی ہے جس کو امام احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ اس دوسری روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحبزادی کو تجدید نکاح اور جدید مہر کے ساتھ پھر ابو العاص ہی کی زوجیت میں دے دیا۔ اس اختلافِ روایت کی صورت میں اول تو یہ نظیر ان حضرات کے یہ قطعی دلیل نہیں رہتی جو اختلافِ دار کی قانونی تاثیر کا انکار کرتے ہیں۔ دوسرے، اگر وہ ابن عباس ہی کی روایت کے صحیح ہونے پر اصرار کریں تو یہ ان کے مسلک کے خلاف پڑتی ہے، کیونکہ ان کے مسلک کی رو سے جن میاں بیوی کے درمیان اختلافِ دین واقع ہو گیا ہو اور وہ باہم خلوت کر چکے ہوں ان کا نکاح عورت کو صرف تین ایام ماہواری آنے تک باقی رہے گا، اس دوران میں دوسرا فریق اسلام قبول کرے تو زوجیت قائم رہے گی، ورنہ تیسری بار ایام آتے ہی نکاح آپ سے آپ منسوخ ہو جائے گا۔ لیکن حضرت زینب کے جس واقعہ سے وہ استدلال کرتے ہیں اس میں زوجین کے درمیان اختلافِ دین واقع ہوئے کئی سال گزر چکے تھے، حضرت زینب کی ہجرت کے چھ سال بعد ابو العاص ایمان لاتے تھے، اور ان کے ایمان لانے سے کم از کم دو سال پہلے قرآن میں وہ حکم نازل ہو چکا تھا جس کی رو سے مسلمان عورت مشرکین پر حرام کر دی گئی تھی۔

(۴) چوتھا مسئلہ ارتداد کا ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ زوجین ایک ساتھ مرتد ہو جائیں، اور دوسری صورت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک مرتد ہو اور دوسرا مسلمان رہے۔

اگر زوجین ایک ساتھ مرتد ہو جائیں تو شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ خلوت سے پہلے ایسا ہو تو فوراً، اور خلوت کے بعد ہو تو عدت کی مدت ختم ہوتے ہی دونوں کا وہ نکاح ختم ہو جائے گا جو حالت اسلام میں ہوا تھا۔ اس کے برعکس حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر چہ قیاس یہی کہتا ہے کہ ان کا نکاح فسخ ہو جائے، لیکن حضرت ابو بکر کے زمانہ میں جو فتوہ ارتداد پر آیا تھا اس میں ہزار ہا آدمی مرتد ہوئے، پھر مسلمان ہو گئے، اور صحابہ کرام نے کسی کو بھی تجدید نکاح کا حکم نہیں دیا، اس لیے ہم صحابہ کے منفعہ فیصلے کو قبول کرتے ہوئے خلافت قیاس یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ زوجین کے ایک ساتھ مرتد ہونے کی صورت میں ان کے نکاح نہیں ٹوٹتے (مبسوط، ہدایہ، فتح القدیر، الفتح علی المذابب الاربعہ) اگر شوہر مرتد ہو جائے اور عورت مسلمان رہے تو نسیہ اور مالکیہ کے نزدیک فوراً نکاح ٹوٹ جائے گا، خواہ ان کے درمیان پہلے خلوت ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ لیکن شافعیہ اور حنابلہ اس میں خلوت سے پہلے اور خلوت کے بعد کی حالت کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ اگر خلوت سے پہلے ایسا ہوا ہو تو فوراً نکاح فسخ ہو جائے گا، اور خلوت کے بعد ہوا ہو تو زمانہ عدت تک باقی رہے گا، اس دوران میں وہ شخص مسلمان ہو جائے تو زوجیت برقرار رہے گی، ورنہ عدت ختم ہونے ہی اس کے ارتداد کے وقت سے نکاح فسخ شدہ شمار کیا جائے گا، یعنی عورت کو پھر کوئی نئی عدت گزارنی نہ ہوگی۔ چاروں فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ خلوت سے پہلے یہ معاملہ پیش آیا ہو تو عورت کو نسیہ، ہر، اور خلوت کے بعد پیش آیا تو پورا مہر پانے کا حق ہوگا۔

اور اگر مرتد ہونے والی عورت ہو تو اس کے بارے میں حنفیہ کا قدیم فتویٰ یہ تھا کہ اس صورت میں بھی نکاح فسخ ہو جائے گا، لیکن بعد کے دور میں علمائے بلخ و سمرقند نے یہ فتویٰ دیا کہ عورت کے مرتد ہونے سے فوراً فرقت واقع نہیں ہوتی اور اس سے ان کا مقصد اس امر کی روک تھام کرنا تھا کہ شوہروں سے پیچھا چھڑانے کے لیے عورتیں کہیں ارتداد کا راستہ اختیار نہ کرنے لگیں۔ مالکیہ کا فتویٰ بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر قرآن یہ بتا رہے ہوں کہ عورت نے محض شوہر سے علیحدگی حاصل کرنے کے لیے بطور حیلہ ارتداد اختیار کیا ہے تو فرقت واقع نہ ہوگی۔ شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ عورت کے ارتداد کی صورت میں بھی قانون وہی ہے جو مرد کے ارتداد کی صورت میں

تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔ اور اگر تمہاری کافر بیویوں کے مہروں میں سے کچھ تمہیں کفار سے واپس نہ ملے اور پھر تمہاری نوبت آتے تو جن لوگوں کی بیویاں ادھر گئی ہیں ان کو اتنی رقم ادا کر دو جو ان کے دیتے ہوئے مہروں کے برابر ہو۔ اور اس خدا سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان

ہے، یعنی غلوت سے پہلے مرتد ہو تو فوراً نکاح فسخ ہو جائے گا، اور غلوت کے بعد ہو تو زمانہ عدت گزرنے تک نکاح باقی رہے گا، اس دوران میں وہ مسلمان ہو جائے تو زوجیت کا رشتہ برقرار رہے گا، ورنہ عدت گزرنے ہی نکاح وقت ارتداد سے فسخ شمار ہوگا۔ ہر کے بارے میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ غلوت سے پہلے اگر عورت مرتد ہوئی ہے تو اسے کوئی مہر نہ ملے گا، اور اگر غلوت کے بعد اس نے ارتداد اختیار کیا ہو تو وہ پورا مہر پائے گی۔ (المبسوط۔ بدایہ۔ فتح القدر۔ المغنی۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

۱۷۔ اس معاملہ کی دو صورتیں تھیں اور اس آیت کا انطباق دونوں صورتوں پر ہوتا ہے :

ایک صورت یہ تھی کہ جن کفار سے مسلمانوں کے معاہدہ تعلقات تھے ان سے مسلمانوں نے یہ معاملہ طے کرنا چاہا کہ جو عورتیں ہجرت کر کے ہماری طرف آگئی ہیں ان کے مہر ہم واپس کر دیں گے، اور ہمارے آدمیوں کی جو کافر بیویاں ادھر رہ گئی ہیں ان کے مہر ہم واپس کر دو۔ لیکن انہوں نے اس بات کو قبول نہ کیا۔ چنانچہ امام نہہری بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے مسلمان ان عورتوں کے مہر واپس دینے کے لیے تیار ہو گئے جو مشرکین کے پاس مکہ میں رہ گئی تھیں، مگر مشرکوں نے ان عورتوں کے مہر واپس دینے سے انکار کر دیا جو مسلمانوں کے پاس ہجرت کر کے آگئی تھیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ہاجر عورتوں کے جو مہر تمہیں مشرکین کو واپس کرنے ہیں وہ ان کو بھیجنے کے بجائے مدینے ہی میں جمع کر لے جائیں اور جن لوگوں کو مشرکین سے اپنے دیتے ہوئے مہر واپس لینے ہیں ان میں سے ہر ایک کو اتنی رقم دے دی جائے جو اسے کفار سے وصول ہونی چاہیے تھی۔

دوسری صورت یہ تھی کہ جن کفار سے مسلمانوں کے معاہدہ تعلقات نہ تھے ان کے علاقوں سے بھی متعدد آدمی اسلام قبول کر کے دارالاسلام میں آگئے تھے اور ان کی کافر بیویاں وہاں رہ گئی تھیں۔ اسی طرح بعض عورتیں بھی مسلمان ہو کر ہجرت کر آئی تھیں اور ان کے کافر شوہروں نے وہاں رہ گئے تھے۔ ان کے بارے میں یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ دارالاسلام ہی میں اوسے کا بدلہ چکا دیا جائے۔ جب کفار سے کوئی مہر واپس نہیں ملتا ہے تو انہیں بھی کوئی مہر

لائے ہو۔

اے نبی، جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں اور اس بات کا عہد کریں

واپس نہ کیا جائے۔ اس کے بجائے جو عورت ادھر آگئی ہے اس کے برے کا ہر اس شخص کو ادا کر دیا جائے جس کی بیوی ادھر رہ گئی ہے۔

لیکن اگر اس طرح حساب برابر نہ ہو سکے، اور جن مسلمانوں کی بیویاں ادھر رہ گئی ہیں ان کے وصول طلب مہر ہجرت کر کے آنے والی مسلمان عورتوں کے مہروں سے زیادہ ہوں، تو حکم دیا گیا کہ اُس مالِ غنیمت سے باقی رہیں اور اگر وہ جائیں جو کفار سے لڑائی میں مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جس شخص کے حصے کا مہر وصول طلب و جانا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم دیتے تھے کہ اس کے نقصان کی تلافی مالِ غنیمت سے کر دی جائے (ابن جریر)۔ اسی مسلک کو عطاء، مجاہد، زہری، مسروق، ابراہیم نخعی، قتادہ، مقاتل اور ضحاک نے اختیار کیا ہے۔ یہ سب حضرات کہتے ہیں کہ جن لوگوں کے مہر کفار کی طرف رہ گئے ہوں ان کا بدلہ کفار سے ہاتھ آئے ہوئے مجموعی مالِ غنیمت میں سے ادا کیا جائے، یعنی تقسیم فنام سے پہلے ان لوگوں کے فوت شدہ مہران کو دے دیئے جائیں اور اس کے بعد تقسیم ہو جس میں وہ لوگ بھی دوسرے سب مجاہدین کے ساتھ برابر کا حصہ پائیں۔ بعض فقہاء یہ بھی کہتے ہیں کہ صرف اموالِ غنیمت ہی نہیں، اموالِ فتنے میں سے بھی ایسے لوگوں کے نقصان کی تلافی کی جاسکتی ہے۔ لیکن اہل علم کے ایک بڑے گروہ نے اس مسلک کو قبول نہیں کیا ہے۔

ہلے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یہ آیت فتح مکہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب مکہ فتح ہوا تو قریش کے لوگ جو حق دجوق حنوذ سے بیعت کرنے کے لیے حاضر ہونے لگے۔ آپ نے مردوں سے کوہ صفا پر خود بیعت لی اور حضرت عمرؓ کو اپنی طرف سے مامور فرمایا کہ وہ عورتوں سے بیعت لیں اور ان باتوں کا اقرار کرائیں جو اس آیت میں بیان ہوئی ہیں (ابن جریر، بروایت ابن عباس۔ ابن ابی حاتم، بروایت قتادہ)۔ پھر مدینہ واپس تشریف لے جا کر آپ نے ایک مکان میں انصار کی نعمتین کو جمع کرنے کا حکم دیا اور حضرت عمرؓ کو ان سے بیعت لینے کے لیے بھیجا (ابن جریر، ابن مردودہ، بزار، ابن جبان، بروایت ام عطیہ انصاریہ)۔ عید کے روز بھی مردوں کے درمیان خطبہ دینے کے بعد آپ عورتوں کے جمع کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں اپنے خطبہ کے دوران میں آپ نے

کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، شہینے پاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی، اور کسی امر معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی۔

یہ آیت تلاوت کر کے ان باتوں کا عہد یا جو اس آیت میں مذکور ہوئی ہیں (بخاری، بروایت ابن عباس، ابن مواتی کے علاوہ بھی مختلف اوقات میں عورتیں فرداً فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کرتی رہیں جن کا ذکر متعدد احادیث میں آیا ہے۔

۱۹ مکہ معظمہ میں جب عورتوں سے بیعت لی جا رہی تھی اُس وقت حضرت ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عقبہ نے اس حکم کی تشریح دریافت کرتے ہوئے حضور سے عرض کیا، یا رسول اللہ! ابوسفیان ذرا بخیل آدمی ہیں، کیا میرے اُپر اس میں کوئی گناہ ہے کہ میں اپنی اور اپنے بچوں کی ضروریات کے لیے ان سے پوچھے بغیر ان کے مال میں سے کچھ لے لیا کروں؟ آپ نے فرمایا نہیں، مگر میں معروف کی حد تک۔ یعنی بس اتنا مال لے لو جو فی الواقع جائز ضروریات کے لیے کافی ہو۔ (احکام القرآن، ابن عربی،

۲۰ اس میں استفاظ حمل بھی شامل ہے، خواہ وہ جائز عمل کا استفاظ ہو یا ناجائز عمل کا۔

۲۱ اس سے دو قسم کے بہتان مراد ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی عورت دوسری عورتوں پر غیر مردوں سے آشنائی کی تہمتیں لگاتے اور اس طرح کے قحطے لوگوں میں پھیلائے، کیونکہ عورتوں میں خاص طور پر ان باتوں کے چرچے کرنے کی بیماری پائی جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ ایک عورت بچہ تو کسی کا جنم اور شوہر کو یقین دلائے کہ یہ تیرا ہی ہے۔ ابو داؤد میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ انہوں نے حضور کو یہ زمانے سنا ہے کہ جو عورت کسی خاندان میں کوئی ایسا بچہ گھسلا لائے جو اس خاندان کا نہیں ہے اس کا اللہ سے کوئی واسطہ نہیں، اور اللہ اُسے کبھی جنت میں داخل نہ کرے گا۔

۲۲ اس مختصر سے فقرے میں دو بڑے اہم قانونی نکات بیان کیے گئے ہیں۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر بھی اطاعت فی المعروف کی تنید لگائی گئی ہے، مانگے حضور کے بارے میں اس امر کے کسی ادنیٰ شبہ کی گنجائش بھی نہ تھی کہ آپ کبھی منکر کا حکم بھی دے سکتے ہیں۔ اس سے خود بخود یہ بات واضح ہو گئی کہ دنیا میں کسی مخلوق کی اطاعت قانونِ خداوندی کے حدود سے باہر جا کر نہیں کی جاسکتی۔

کیونکہ جب خدا کے رسول تک کی اطاعت معروف کی شرط سے مشروط ہے تو پھر کسی دوسرے کا یہ مقام کہاں ہو سکتا ہے کہ اسے غیر مشروط اطاعت کا حق پہنچے اور اس کے کسی ایسے حکم یا قانون یا ضابطے اور رسم کی پیروی کی جائے جو قانون خداوندی کے خلاف ہو۔ اس قاعدے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے :

لا طاعة في معصية الله ، انما الطاعة في المعروف ۛ اللہ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے، اطاعت صرف معروف میں ہے۔ ”مسلم، ابوداؤد، نسائی،۔ یہی مضمون اکابر اہل علم نے اس آیت سے مستنبط کیا ہے حضرت عبدالرحمن بن زید بن اسلم فرماتے ہیں :

”اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ تمہاری نافرمانی نہ کریں، بلکہ فرمایا یہ ہے کہ وہ معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے نبی تک کی اطاعت کو اس شرط سے مشروط کیا ہے تو کسی اور شخص کے لیے یہ کیسے سزاوار ہو سکتا ہے کہ معروف کے سوا کسی معاملہ میں اس کی اطاعت کی جائے“ (ابن جریر)۔

امام ابو بکر حبصاں لکھتے ہیں :

”اللہ کو معلوم تھا کہ اس کا نبی کبھی معروف کے سوا کسی چیز کا حکم نہیں دیتا، پھر بھی اس نے اپنے نبی کی نافرمانی سے منع کرتے ہوئے معروف کی شرط لگا دی تاکہ کوئی شخص کبھی اس امر کی گنجائش نہ نکال سکے کہ ایسی حالت میں بھی سلاطین کی اطاعت کی جائے جبکہ ان کا حکم اللہ کی اطاعت میں نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ من اطاع مخلوقاً في معصية المخلوق سخط الله عليه ذالك المخلوق، یعنی جو شخص خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت کرے، اللہ تعالیٰ اس پر اسی مخلوق کو مستط کر دیتا ہے“ (احکام القرآن)۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں :

”یہ ارشاد ان جاہلوں کے خیال کی تردید کرتا ہے جو سمجھتے ہیں کہ اولی الامر کی اطاعت مطلقاً لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو رسول کی اطاعت پر بھی معروف کی قید لگا دی ہے، حالانکہ رسول کبھی معروف کے سوا کوئی حکم نہیں دیتا۔ اس سے مقصود لوگوں کو خبردار کرنا ہے کہ خالق کی معصیت

میں کسی کی اطاعت جائز نہیں ہے۔“ (روح المعانی)

پس درحقیقت یہ ارشاد اسلام میں قانون کی حکمرانی (RULE OF LAW) کا سنگ بنیاد ہے۔ اسولی بات یہ ہے کہ ہر کام جو اسلامی قانون کے خلاف ہو، جرم ہے اور کوئی شخص یہ حق نہیں رکھتا کہ ایسے کسی کام کا کسی کو حکم دے۔ جو شخص بھی خلاف قانون حکم دیتا ہے وہ خود مجرم ہے، اور جو شخص اس حکم کی تعمیل کرتا ہے وہ بھی مجرم ہے۔ کوئی ماتحت اس عذر کی بنا پر منراے نہیں بچ سکتا کہ اس کے افسر بالانے اسے ایک ایسے فعل کا حکم دیا تھا جو قانون میں مجرم ہے۔

دوسری بات جو آئینی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتی ہے یہ ہے کہ اس آیت میں پانچ منفی احکام دینے کے بعد مثبت حکم صرف ایک ہی دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ تمام نیک کاموں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت کی جائے گی۔ جہاں تک برائیوں کا تعلق ہے، وہ بڑی بڑی برائیاں گناہی گنہیں جن میں زمانہ باہلیت کی عورتیں مبتلا تھیں اور ان سے باز رہنے کا عہد لے لیا گیا، مگر جہاں تک بھلائیوں کا تعلق ہے ان کی کوئی تہمت دے کر عہد نہیں لیا گیا کہ تم فلاں فلاں اعمال کرو گی بلکہ صرف یہ عہد لیا گیا کہ جس نیک کام کا بھی حضور حکم دیں گے اس کی پیروی تمہیں کرنی ہوگی۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ نیک اعمال صرف وہی ہوں جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دیا ہے تو عہد ان الفاظ میں لیا جانا چاہیے تھا کہ ”تم اللہ کی نافرمانی نہ کرو گی“ یا یہ کہ ”تم قرآن کے احکام کی نافرمانی نہ کرو گی“ لیکن جب عہد ان الفاظ میں لیا گیا کہ ”جس نیک کام کا حکم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیں گے تم اس کی خلاف ورزی نہ کرو گی“ تو اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاشرے کی اصلاح کے لیے حضور کو وسیع ترین اختیار دینے گئے ہیں اور آپ کے تمام احکام واجب اطاعت ہیں خواہ وہ قرآن میں موجود ہوں یا نہ ہوں۔

اسی آئینی اختیار کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت یتے ہوئے ان بہت سی برائیوں کے چھوڑنے کا عہد لیا جو اُس وقت عرب معاشرے کی عورتوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور متعدد ایسے احکام دینے جو قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔ اس کے لیے حسب ذیل احادیث ملاحظہ ہوں:

ابن عباسؓ، ام سلمہؓ اور ام عطیہؓ انصاریہ وغیرہ کی روایات ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے بیعت یتے وقت یہ عہد لیا کہ وہ مرنے والوں پر فحش نہ کریں گی۔ یہ روایات بخاری، مسلم، نسائی اور ابن جریر

نے نقل کی ہیں۔

ابن عباسؓ کی ایک روایت میں یہ تفصیل ہے کہ حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو عورتوں سے بیعت لینے کے لیے مامور کیا اور حکم دیا کہ ان کو فوطہ کرنے سے منع کریں، کیونکہ زناۃ بالہیت میں عورتیں مرنے والوں پر فوطہ کرنے ہوسے کپڑے پھاڑتی تھیں منہ لڑھکتی تھیں، بال کاٹتی تھیں اور سخت واویلا مچاتی تھیں (ابن جریر)

زید بن اسلم روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے بیعت لیتے وقت عورتوں کو اس سے منع کیا کہ وہ مرنے والوں پر فوطہ کرتے ہوسے اپنے منہ فوطیں اور گریبان پھاڑیں اور واویلا کریں اور شعر گا گا کر بہن کریں (ابن جریر)۔ اسی کی ہم معنی ایک روایت ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے ایک ایسی خاتون سے نقل کی ہے جو بیعت کرنے والیوں میں شامل تھیں۔

قتادہ اور حسن بصری رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ جو عہد حضورؐ نے بیعت لیتے وقت عورتوں سے لیتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ غیر محرم مردوں سے بات نہ کریں گی۔ ابن عباسؓ کی روایت میں اس کی یہ وضاحت ہے کہ غیر مردوں سے تخلیہ میں بات نہ کریں گی۔ قتادہ نے مزید وضاحت یہ کی ہے کہ حضورؐ کا یہ ارشاد اٹھن کہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم گھر پر نہیں ہوتے اور ہمارے ہاں کوئی صاحب ٹٹے آجاتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا میری مراد یہ نہیں ہے۔ یعنی عورت کا کسی آنے والے سے اتنی بات کہہ دینا ممنوع نہیں ہے کہ صاحب خانہ گھر میں موجود نہیں ہیں۔ (یہ روایات ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے نقل کی ہیں)۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خالہ امینہ بنت رقیقہ سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ زین العاص نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے ان سے یہ عہد لیا کہ فوطہ نہ کرنا اور جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار کر کے اپنی نمائش نہ کرنا (مشاعر ابن جریر)۔ حضورؐ کی ایک خالہ سلمیٰ بنت قیس کہتی ہیں کہ میں انصار کی چند عورتوں کے ساتھ بیعت کے لیے حاضر ہوئی تو آپؐ نے قرآن کی اس آیت کے مطابق ہم سے عہد لیا، پھر فرمایا ولا تعفشن اذا حکن، اپنے شوہروں سے دھوکے بازی نہ کرنا۔ جب ہم واپس ہونے لگیں تو ایک عورت نے مجھ سے کہا کہ جا کہ حضورؐ سے پوچھو شوہروں سے دھوکے بازی کرنے کا کیا مطلب ہے میں نے جا کہ پوچھا تو آپؐ نے فرمایا تاخذ مالہ فتجابی بہ غیرہ، یہ کہ تو اس مال سے اور مردوں پر کھڑی (مشاعر) ام علیہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے بیعت لینے کے بعد جس حکم دیا کہ ہم عیدین کی جماعت میں حاضر ہوا کریں گی البتہ جمعہ ہم پر فرض نہیں ہے، اور جنازوں کے ساتھ جانے سے ہمیں منع فرمایا (ابن جریر)۔

توران سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو، یقیناً اللہ درگزر فرمائے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

جو لوگ حضور کے اس آئینی اختیار کو آپ کی حیثیت رسالت کے بجائے حیثیت امارت سے متعلق قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ چونکہ اپنے وقت کے حکمراں بھی تھے اس لیے اپنی اس حیثیت میں آپ نے جو احکام دیئے وہ صرف آپ کے زمانے تک ہی واجب الطاعت تھے، وہ بڑی جہالت کی بات کہتے ہیں۔ اوپر کی سطور میں ہم نے حضور کے جو احکام نقل کیے ہیں ان پر ایک نگاہ ڈال لیجیے۔ ان میں عورتوں کی اصلاح کے لیے جو ہدایات آپ نے دی ہیں وہ اگر محض حاکم وقت ہونے کی حیثیت سے ہوتیں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پوری دنیا کے مسلم معاشرے کی عورتوں میں یہ اصلاحات کیسے رائج ہو سکتی تھیں؟ آخر دنیا کا وہ کونسا حاکم ہے جس کو یہ مرتبہ حاصل ہو کہ ایک مرتبہ اس کی زبان سے ایک حکم صادر ہو اور وہ نئے زمین پر جہاں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں وہاں کے مسلم معاشرے میں ہمیشہ کے لیے وہ اصلاح رائج ہو جائے جس کا حکم اس نے دیا ہے؟ درزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورہ عتھر، باب ۱۵، ۲۳ معتبر اور متعدد امام دین سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتوں سے بیعت لینے کا طریقہ مردوں کی بیعت سے مختلف تھا۔ مردوں سے بیعت لینے کا طریقہ یہ تھا کہ بیعت کرنے والے آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر عہد کرتے تھے۔ لیکن عورتوں سے بیعت لینے پر آپ نے کبھی کسی عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لیا، بلکہ مختلف طریقے اختیار فرمائے۔ اس کے بارے میں جو روایات منقول ہوئی ہیں وہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ”خدا کی قسم بیعت میں حضور کا ہاتھ کبھی کسی عورت کے ہاتھ سے چھوا تک نہیں ہے۔ آپ عورت سے بیعت لینے ہوئے بس زبان مبارک سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے تجھ سے بیعت لی زنجاری بن جا“ ائمہ نبت رقیقہ کا بیان ہے کہ میں اور چند عورتیں حضور کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوئیں اور آپ نے قرآن کی اس آیت کے مطابق ہم سے عہد لیا۔ جب ہم نے کہا ”ہم معروف ہیں آپ کی نافرمانی نہ کریں گی“ تو آپ نے فرمایا ”فیما استطعتمن واطقتن“ جہاں تک تمہارے بس میں ہو اور تمہارے لیے ممکن ہو۔“ ہم نے عرض کیا ”اللہ اور اس کا رسول ہمارے لیے خود ہم سے بڑھ کر رحیم ہیں“ پھر ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہاتھ بڑھائیے

ع

اُسے لوگوں جو ایمان لاتے ہو، اُن لوگوں کو دوست نہ بناؤ جن پر اللہ نے غضب فرمایا ہے۔ جو آخرت سے اسی طرح مایوس ہیں جس طرح قبروں میں پڑے ہوئے کا فر مایوس ہیں۔

تاکہ ہم آپ سے بیعت کریں۔ آپ نے فرمایا میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا، بس میں تم سے عہدوں کا۔ چنانچہ آپ نے عہد لے لیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے ہم میں سے کسی عورت سے بھی مصافحہ نہیں کیا۔ سند احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر، ابن ابی حاتم،

ابوداؤد نے مراسیل میں شعبی کی روایت نقل کی ہے کہ عورتوں سے بیعت بیتے وقت ایک چادر حضور کی طرف بڑھائی گئی۔ آپ نے بس اسے ہاتھ میں لے لیا اور فرمایا میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔ یہی مضمون ابن ابی حاتم نے شعبی سے، عبدالرزاق نے ابراہیم نخعی سے اور سعید بن منصور نے قیس بن ابی حازم سے نقل کیا ہے۔ ابن اسحاق نے منازمی میں ابان بن صالح سے روایت نقل کی ہے کہ حضور پانی کے ایک برتن میں ہاتھ ڈال دیتے تھے، اور پھر اسی برتن میں عورت بھی اپنا ہاتھ ڈال دیتی تھی۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ عید کا خطبہ دینے کے بعد آپ مردوں کی صفوں کو پھرتے ہوئے اس مقام پر تشریف لے گئے جہاں عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ آپ نے وہاں اپنی تقریر میں قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی، پھر عورتوں سے پوچھا تم اس کا عہد کرتی ہو؟ مجمع میں سے ایک عورت نے جواب دیا یا رسول اللہ۔ ایک روایت میں ہے ابن جبان، ابن جریر اور تبار وغیرہ نے نقل کیا ہے، ام عطیہ انصاریہ کا یہ بیان ملتا ہے کہ حضور نے گھر کے باہر سے ہاتھ بڑھایا اور ہم نے اندر سے ہاتھ بڑھائے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عورتوں نے آپ سے مصافحہ بھی کیا ہو، کیونکہ حضرت ام عطیہ نے مصافحہ کی تصریح نہیں کی ہے۔ غالباً اس موقع پر صورت یہ رہی ہوگی کہ عہد دیتے وقت آپ نے باہر سے ہاتھ بڑھایا ہوگا اور اندر سے عورتوں نے اپنے اپنے ہاتھ آپ کے ہاتھ کی طرف بڑھا دیئے ہونگے بغیر اس کے کہ ان میں سے کسی کا ہاتھ آپ کے ہاتھ سے مس ہو۔

لکن اصل الفاظ ہیں قَدْ يَلْتَمِسُوا مِمَّا اخَذْتُمْ كَمَا يَلْتَمِسُ الْكُفَّارُ مِنَ اصْحَابِ الْقُبُورِ۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ آخرت کی بھلائی اور اس کے ثواب سے اسی طرح مایوس ہیں جس طرح زندگی بعدت سے انکار کرنے والے اس بات سے مایوس ہیں کہ ان کے جو عزیز رشتہ دار قبروں میں جا چکے ہیں وہ کبھی پھر زندہ کر کے

(بقیہ تفہیم القرآن)

اٹھائے جائیں گے۔ یہ معنی حضرت عبداللہ بن عباسؓ، اور حضرت حسن بصریؒ، قتادہ اور سخاک رحمہم اللہ نے بیان کیے ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ آخرت کی رحمت و مغفرت سے اسی طرح مایوس ہیں جس طرح قبروں میں پڑے ہوئے کافر ہر خیر سے مایوس ہیں، کیونکہ انہیں اپنے مبتلائے عذاب ہونے کا یقین ہو چکا ہے۔ یہ معنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، اور حضرات مجاہد، عکرمہ، ابن زید، کلیبی، مقاتل اور منصور رحمہم اللہ سے منقول ہیں۔